Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:9 (1969)

انتخاب ——— از رسالۂ جامعہ، دہلی ———

ضیاء گوکلپ اور ترک قومیت کی تشکیل

پروفیسر نیازی برکس

جدید ترکی کی تاریخ میں ضیاء گوکلپ کا مرتبہ ایک مفکّر اور عالم کی حیثیت سے بہت اونچا ہے۔ کہتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال کی انقلابی اصلاحات کے پیچھے بڑی حد تک اُس کے نظریات ہی کی کارفرمائی تھی۔ پروفیسر نیازی برکس کا یہ مضمون ۱۹۵۴ء میں "مڈل ایسٹ جرنل" میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمود الحسن صاحب نے اس مضمون کے ضروری حصوں کا آزاد ترجمہ کیا ہے، جسے ہم شائع کر رہے ہیں۔ پچھلے دس سال میں ترکی کے حالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ سیکولرزم اب ترک عوام میں مقبول نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ابھی ایسا بھی نہیں کہ اس کے خلاف کوئی علمی و فکری تحریک ہو۔ تعلیم یافتہ طبقہ اب بھی سیکولرزم کے اُصولوں کا حامی ہے۔ ہاں اصلاحات کے نام پر کئی ایسی چیزیں جو قانون اور ریاست کے جبر سے عوام پر لادی گئی تھیں، اُن کے خلاف شدید ردِّعمل ظاہر ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اسباب کی بِنا پر ضیاء گوکلپ کے نظریئے کو مکمل طور پر نہ تو مصطفیٰ کمال نے عملی شکل دی اور نہ ان کے بعد اُن کے ہم خیال ترک رہنماؤں نے اس کی کوشش کی۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مغربی تمدن کو اپنا لینے کے بعد بھی ترک قوم جاپانیوں کی طرح ایک بڑی صنعتی طاقت کیوں نہ بن سکی؟

(مُدیر)

ضیاء گوکلپ بیسویں صدی کے ترک مصنفین میں سب سے زیادہ با اثر اور طباع مصنف کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کی موت پر ۴۴ سال گزر گئے مگر آج بھی اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کا انتقال ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اس نے اپنی تصانیف ۱۹۱۱ء — ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء۔ ۱۹۲۴ء کے دوران مکمل کی ہیں۔ پہلے دور میں اس نے تہذیبی تبدیلی کے بنیادی مسائل پر بحث و جستجو کی نئی راہ اپنائی۔

یہ تبدیلی ۱۹۰۸ء میں دستوری نظام کی بحالی کے بعد ترکی میں شدت اختیار کر چکی تھی۔ دوسرے دور میں وہ انہیں راستوں پر گامزن رہا۔ حالاں کہ اناطولیہ میں مصطفےٰ کمال کی زیرِ نگرانی قومی حکومت کے قیام سے اس کے خیالات کا بڑا حصہ عملی صورت اختیار کر چکا تھا۔

گوکلپ کی تصنیفات میں مرکزی موضوع یہ سوال تھا کہ ترکوں کو مغربی تمدن کس طرح اپنانا چاہیئے اور اس مغربی تمدن کو کس طرح ترکوں کی دو تاریخی روایات یعنی 'ترکیت' اور اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں ترک بحیثیت قوم اور اسلام بحیثیت مذہب جدید تمدن کے احوال میں کیا مقام متعین کریں۔ ظاہر ہے یہ مسائل نئے نہیں تھے۔ ضیاء سے پہلے بھی اہلِ فکر نے اِن کو چھیڑا اور اس پر غور و فکر کیا تھا۔ ضیاء کی ندرت یہ ہے کہ اس نے ان سوالات پر باقاعدہ اور مرابوط اسکیم کے تحت بحث کی۔ اس کی تفصیلات و فروعات کا تجزیہ کیا۔ ان سے نتائج اخذ کئے اور بعد میں انہیں کو تہذیبی پالیسی کے لئے بطور لائحۂ عمل کے پیش کیا۔

اس نے پہلے پہل یہ کام اس وقت شروع کیا جب مملکتِ عثمانی تکلیف دہ حد تک زوال پذیر تھی۔ اس وقت نئے قومی نظام کا ارتقا کسی قدر مبہم مرحلہ میں تھا۔ بلاشبہ ان دونوں احوال نے ضیاء کے کام کو صوری و معنوی خوبیوں و خامیوں کی حیثیت سے متاثر کیا۔ بہرحال پہلی جنگِ عظیم میں شکست کے بعد مملکتِ عثمانی کے زوال نے اس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں سازگار ماحول تیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اتاترک کی انتہاپسندانہ اصلاحات کے ابتدائی دور میں اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ تاہم ان اصلاحات کے پیچھے جو خیالات کارفرما ہیں، وہ ضیاء کی تصنیفات میں نظر آئیں گے۔ جہاں تک اس کی اسلامی اصلاحات کی تفصیلات کا تعلق ہے، اس کے خیالات کو شدید لامذہبیت کے آخری دور میں سخت صدمہ پہنچا۔ پھر بھی میرا یقین ہے کہ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اتاترک کی پالیسی سے ہم آہنگ ہونے کے قابل ہو جاتا۔ مزید برآں ہم کو معلوم ہے کہ سیکولرزم، ضمیر کی آزادی اور فکر کی آزادی سے متعلق دستوری دفعات اسی کے قلم کی مرہونِ منت ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر تھا، جس نے ۱۹۲۴ء میں نیا دستور تیار کیا تھا۔ شاید ضیاء کے لئے اتاترک کی بے میل لسانی پالیسی سے متفق ہونا مشکل ترین مسئلہ ہوتا۔ تاہم وہ ترک جمہوریہ کے بنیادی رجحانات مثلاً مغربیت، جمہوریت، سیاسی، معاشی اور قومی آزادی اور لامذہبیت کو منضبط کرنے والا لائق ترین فرد ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے مباحث کے کچھ حصے سے انحراف کیا جاتا رہا

ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بنیادی مسائل سے متعلق آج بھی اسی کا طرزِ فکر ہے جو ترکی کی جدید اصلاحات کے پیچھے عقلی قوت بن چکا ہے۔

ضیا، کے افکار کے عملی پہلو اور پہلی جنگِ عظیم سے قبل اور بعد کے برسوں میں ان خیالات کے سیاسی عمل سے قریبی ربط کی بنا پر چند نقادوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ترکی کی بدنصیبیوں کا ذمہ دار ضیا، ہی ہے۔ لیکن اس نظریاتی ربط کے باوجود ضیا، ہمیشہ سیاست سے الگ تھلگ رہا اور بحیثیت اُستاد اور مصنف کے زندگی گزاری۔ اس نے حکومت میں ذمہ داری کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اور نہ کبھی سیاسی یا ذاتی مفاد کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ اس نے تقریباً تنہائی کی زندگی گزاری کیونکہ وہ صاحبِ کردار غازی کی صفات سے محروم تھا۔ وہ بے انتہا شرمیلا اور مطالعۂ باطن کا عادی تھا۔ اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وہ ترک نوجوانوں پر غیر معمولی ساحرانہ اثر رکھتا تھا اور دوسری طرف مجلسِ اتحاد و ترقی کے سیاست داں بھی اس سے متاثر تھے۔ اُس کو ہم اِس طرز کا دانش مند کہہ سکتے ہیں، سرزمینِ مشرق سے اُٹھتے رہے ہیں۔ اس کے یہاں نمایاں طور پر صوفیانہ میلانات ملتے ہیں۔ اس لئے تصوّف اس کی فکر میں ہمیشہ اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ یہی خصوصیت آج اس کے مقام کے تعین میں تضاد کی صورت پیدا کرتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اتنی مؤثر شخصیت اور اپنے متاثرین کا اتنا بڑا حلقہ رکھنے کے باوجود اس کی تصنیفات چند منتشر مضامین کے علاوہ بہت حد تک غیر معروف اور قارئین کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ چند نعرے اور وقتی طور پر متاثر کرنے والے جملے جنہیں اس نے مقبول عوام بنا دیا تھا، لوگوں کے ہونٹوں پر اور حافظوں میں محفوظ رہ گئے۔ اس کے خیالات کا خاصہ حصہ مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا۔ یا انہیں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور جن خیالات کو ضیا، نے اپنی زندگی ہی میں رد کر دیا تھا، وہ اس کی جانب منسوب کئے جاتے رہے۔ سوشلسٹ، انتہا پسند نسل پرست، مغرب پرست اور آزاد خیال سب نے اس پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے "SOLIDARISM"[۱] یا "SYNDICALISM"[۲] اور خلافت کے مثالی تصوّر کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس کی تحریروں کا ایک

---

۱ مفاد میں اشتراک و یکسانیت۔

۲ فرانسیسی مزدوروں کی تنظیم جس کا مقصد ذرائع پیداوار کو مزدوروں کی انجمن کے ہاتھوں میں دے دینا ہے۔

حصہ رومن رسم خط میں بار بار شائع ہوا ہے، لیکن اس کا کوئی مکمل ایڈیشن اب تک نہیں چھپا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی تصنیفات کی کوئی قابلِ اعتماد اور جامع فہرست بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک سبب رسم الخط کی تبدیلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسباب ہیں جن کی اہمیت ہے۔ شاید ان میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اس کی بیشتر تحریریں رسالوں میں شائع ہوئیں۔ مثلاً روزناموں کے اندر مختصر مضامین کی صورت میں انھیں جگہ ملی۔ وہ چند کتابیں بھی (ایک یا دو کو چھوڑ کر) جو اس کی زندگی میں چھاپی گئیں، مضامین کا مجموعہ تھیں۔ وہ رسالے اور اخبارات جن کے لئے وہ لکھتا تھا، ان میں کئی ایسے ہیں جو آج آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ بہت مختصر عرصہ تک جاری رہے ہے۔ ان کی صرف چند کاپیاں موجود ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ گوکلپ کی تصنیفی زندگی کا سرگرم ترین دَور اس عہد سے تعلق رکھتا ہے، جو ترکی کی تاریخ کا نازک ترین اور غیر مستحکم دَور شمار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے دَور میں غور و فکر کے ساتھ مفصل کتاب لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا ہے، اُسے اپنے وسیع مطالعہ کو کتابی شکل میں منضبط کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے تاریخی، عمرانی اور فلسفیانہ خیالات کو تفصیل سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اور آخری سبب اس دَور کی وہ سماجی و نفسیاتی حقیقت ہے، جسے اس سلسلہ میں ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ سماجی انقلاب، تغیر کلی اور پراگندگی کے زمانے میں وہ خیالات جو عوام کے لئے کشش رکھتے ہیں، افسانوں میں بدل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عوام ان امتیازات کو جو ایک مفکر اپنے تصورات کے مجموعی ڈھانچہ میں قائم کرتا ہے، ادراک نہیں کر پاتے۔ وہ اصطلاحات کی جو متعین اور جنچی تلی تعریف کرتا ہے، ان تک نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ اس لئے وہ لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج بھی تہذیب و تمدن کے درمیان ضیا نے جو فرق قائم کیا ہے، اس کو لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور ایک سمجھ دار آدمی کو حیرت ہوتی ہے جب مغربی قوم پرستی کے مخالف نظریہ یا نسل پرستی اور نسلی قومیت کا اصول اس کی تحریروں سے اخذ کیا جائے۔

ایسے اہم اور بڑے مسائل جنہیں گوکلپ نے چھیڑا ہے، وہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں رونما ہو چکے تھے۔ یہ دَور ترکی کی تاریخ میں دورِ تنظیمات کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسائل بالخصوص اس وقت پیدا ہوئے، جب دولتِ عثمانیہ کے سیاسی، قانونی اور انتظامی ڈھانچہ کو از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ ترکی پہلے ہی مغربی اثر کے تحت آ چکا تھا۔ مزاحمت کے باوجود اٹھارہویں صدی

میں مغربی تمدّن کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے مسلسل واضح آثار نظر آنے لگے تھے لیکن یہ محض آثار تھے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی و فکری زندگی میں کوئی حقیقی تبدیلی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ بات حیرت کی ہے کہ ترکی میں اٹھارہویں صدی میں پریس جیسی انقلاب آفرین شئے کے باوجود ذہنی و فکری زندگی پر اب بھی مدرسہ سسٹم کا طرزِ فکر چھایا ہُوا تھا۔ اسی طرح ادب اور آرٹ پر بھی روایت پرستی کا غلبہ تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں بے اطمینانی کے اس احساس نے جو اٹھارہویں صدی ہی میں ظاہر ہوگئے تھے، مغربی اصولوں کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ پہلا انقلابی قدم یہ اُٹھایا گیا کہ جنیسری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اُٹھنے لگی۔ یہ نظام ایک خاص قسم کی سپاہیانہ جاگیرداری کی جگہ لے رہا تھا۔ عثمانی تاریخ میں پہلی بار ایک اہم ادارہ کو تباہ کر کے اس کی جگہ دوسرے نظام کو لانا ضروری ہوگیا تھا۔ یہ کام روس میں کسی حد تک ایک صدی پیشتر پیٹر اعظم کی اصلاحات کے مشابہ تھا۔ ۱۸۳۹ء - ۱۸۵۶ء کے دَوران تنظیمات کے فرامین دراصل اس تحریک کی سرکاری طور پر توثیق کرتے تھے۔ یہیں سے یہ حقیقت بطور طے شدہ پالیسی کے تسلیم کر لی گئی کہ اُن پُرانے اداروں کو جو جدید اداروں سے ہم آہنگ اور موافق نہیں ہوتے، اُنہیں ختم کر دیا جائے اور نئے ادارے مغربی نمونوں پر قائم کیے جائیں۔ لیکن اس راہ میں متوازن اور ہم آہنگ طور پر آگے بڑھنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک یہ کہ اسٹیٹ اور حکومت کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ یعنی مستبد اور مطلق العنان عثمانی سلطنت اپنے آپ کو جمہوری سانچے میں ڈھالے۔ دوسری رکاوٹ عہد وسطےٰ کے معاشی اور سماجی ادارے تھے۔ یہ ادارے کسی طرح مغرب کی پھیلتی ہوئی معاشیات کے جدید اُصولوں اور نئے اداروں سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ یہی دو بڑے سبب ہیں جن کی بنا پر تنظیماتی رہنماؤں کو تجدد کے عمل کو جاری رکھنے میں ناکامی ہوئی۔ تنظیمات کے رہنما چند چیزوں میں تو تجدّد چاہتے تھے اور باقی چیزوں کو جوں کا توں رکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس دوعملی کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ مغرب کی نقالی کی جائے۔ اور اپنی اسکیموں کو تضاد کا شکار ہونے دیا جاتے۔ اور وہی ہوا۔ یعنی زندگی کے تقریباً ہر میدان میں "ثنویت" کا ایک سلسلہ پیدا ہوگیا۔ سیاست، انتظامیہ، قانونی نظام، تعلیم اور ذہنی زندگی کے میدانوں میں دو طرح کے ادارے، دو وضع کے تصورات اور دو قسم کی وفاداریاں ایک پُرانے نظام کے ساتھ اور دوسری جدید نظام سے

پہلو بہ پہلو وجود میں آتی گئیں۔

نامق کمال (۱۸۴۰ء - ۱۸۸۸ء) نے اِس مریضانہ کیفیت کی تشخیص کی اور اس کو جدید اسٹیٹ کے قیام کی راہ میں اہم ترین رکاوٹ قرار دیا۔ اس نے اسلام کے مذہبی، اخلاقی اور قانونی اداروں کی مثالی اور حقیقی صورت دکھانے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی خالص عثمانی اداروں کا حقیقی روپ نکھارنے کی جدوجہد کی اور مغربی تمدن کے ان پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا، جن کی وجہ سے مغربی اقوام ترقی، خوش حالی اور سربلندی سے ہمکنار ہوئیں۔ ان تینوں عناصر پر بحث کے بعد وہ اس نتیجہ پہ پہنچا کہ ان کے مابین بنیادی اختلافات نہیں پائے جاتے۔ اس کا خیال تھا کہ اسلام سماج کے لئے اخلاقی اور قانونی بنیادیں فراہم کرے گا۔ جہانبانی کی عثمانی روایات اپنی کثیر القومی اور کثیر المذہبی خصوصیات رواداری اور وسیع المشربی کی پالیسی کے ذریعہ عثمانی مملکت کا سیاسی نقشہ تیار کریں گی۔ اور مغربی تمدن اس نظام کے لئے مادی اور عملی ضابطہ تکنیک مہیا کرے گا تاکہ ترکی جدید دَور کی طاقت اور معاشی ترقی کی دنیا میں زندہ رہنے کے قابل ہو سکے۔ اس طرح نامق کمال نے ترکوں کی انیسویں صدی کی زندگی میں ان تینوں عناصر کے دائرۂ عمل کو متعین کیا۔ اس کے خیال میں تنظیمات کی ناکامی کا اہم سبب وہ انتشار تھا، جو ان تینوں عناصر کے بارے میں رہنماؤں کے دماغ پر مسلط ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر انہوں نے فرانس کے مجموعۂ قوانین کو اپنانے کی غرض سے شریعت کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ تعلیم، حکومت، سائنس، معاشیات اور زراعت میں مغرب کے اصولوں کو رواج نہیں دیا گیا۔ مملکت کو جدید بنانے کے لئے تنظیماتی لیڈروں نے غیر ضروری حد تک اُن مغربی طاقتوں کے معاشی اور سیاسی بوجھ کو قبول کیا، جنہوں نے دولتِ عثمانیہ کی علاقائی سالمیت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ انہوں نے اپنے نظام میں جدید جمہوری نظام حکومت کے کسی اصول کو بھی نہیں برتا۔ حالاں کہ قدیم عثمانی سیاسی ادارے اور اسلامی قوانین جمہوریت اور جدید سائنس کے مخالف نہ تھے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ مغرب کے سامراجی نظام کی سازشوں کے سبب اس کی فرصت بھی نہیں ملی کہ امن و سلامتی کی فضا میں ان تینوں عناصر میں ہم آہنگی کا موقع ملتا۔

پہلے تو واقعات کی رفتار نامق کمال کے تصورات سے مختلف تھی اور ان افکار کو سختی سے دبا دیا گیا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب کے بعد ان کو سازگار ماحول ملا۔ لیکن اس ماحول کو وہ تین نظریاتی تحریکیں بھی ورثہ میں ملیں جو سلطان عبدالحمید کے عہد میں ظاہر ہوئی تھیں، لیکن اس کے استبداد

کے سبب ان میں سے دو کو برگ و بار لانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان میں ایک تھی 'اسلامیت' جو پین اسلامزم کی حامی تھی اور اسلام پر مغربی مصنفین کی تنقید کے مقابلہ میں مدافعانہ طرزِ فکر بھی رکھتی تھی۔ دوسرا عنصر 'مغربیت' کا تھا۔ اس کے پرستاروں میں لامذہبوں کی تعداد زیادہ تھی، جس میں نئے سیکولر تعلیمی اداروں کی بنا پر روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اِن کے علاوہ ایک اور چھوٹی سی جماعت وجود میں آئی جو ترکیت کے تصور کی حامل تھی۔ اس کے حامی روسی حکومت کے تحت ترکی زبان بولنے والے عوام کی سیاسی، معاشی اور ادبی بیداری سے سرشار تھے۔ اِن پر ان مغربی ادیبوں کا بھی اثر تھا، جو رومانیت سے مخمور تھے۔ اُنھوں نے نامق کمال کے اُستاد شناسی کی تحریک سے بھی کسبِ فیض کیا تھا، جس کی خصوصیت ترکی زبان اور ماضی سے دلچسپی تھی۔ مملکتِ عثمانی کی غیر مُسلم اور ترک جماعتوں کی قوم پرستانہ تحریکوں نے بھی ان کو متاثر کیا تھا، اور ساتھ ہی پین سلاوازم اور پین جرمن ازم جیسی فکری و سیاسی تحریکوں کا اثر بھی ان کے خیالات پر پڑا۔

بہرحال اسلام پسندوں، مغرب پرستوں اور ترکیت کے حامیوں میں جو چیز قدرِ مشترک کے طور پر تھی، وہ عثمانیت تھی، کوئی گروہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ عثمانی سلطنت جس میں مختلف مذہب، زبان اور نسل کے لوگ شامل تھے ختم ہو جائے۔ لیکن رفتہ رفتہ یوسف اکورا کی پین تورانی تحریک کا اثر نوجوان ترکوں میں نفوذ کر گیا اور ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے پہلے جو ذہنی انتشار تھا، اس میں کاکیشیا کے ڈاکٹر حسین زادہ علی کے اِس پیرو کی آواز ہی واضح اور پُر اثر تھی۔ اس نے سیاسی سطح پر وضاحت سے اپنے خیال پیش کئے اور یہ بتایا کہ اسی میں عثمانیت کی بقا اور ترکوں کا فائدہ ہے۔ انجمن اتحاد و ترقی کی میٹنگوں میں جو بحثیں ہوتی تھیں، ان میں ہر طرح کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پین تورانی نظریہ زیادہ مقبول تھا۔ (مسلسل)